© rasailojaraid.com



# ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا تصوّرِ خلافت

تحریر: ڈاکٹر صہیب حسن (لندن)

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام ۱۹۔۲۰ مارچ ۲۰۱۱ء کو قرآن آڈیٹوریم لاہور میں ''ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی قرآنی' دینی اور ملی خدمات'' کے عنوان سے دو روزہ محاضراتِ قرآنی کا اہتمام کیا گیا۔ محاضرات کے دوسرے سیشن میں مولانا عبدالغفار حسنؒ کے خلف الرشید ڈاکٹر صہیب حسن حفظہ اللہ (چیئرمین القرآن سوسائٹی' لندن) نے ''ڈاکٹر اسرار احمد کا تصورِ خلافت'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش فرمایا۔ مقالہ پڑھنے سے پیشتر موصوف نے چند منٹ کی تمہیدی گفتگو بھی فرمائی۔ یہ گراں قدر مقالہ تمہیدی گفتگو سمیت قارئین حکمت قرآن کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ۭ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ﴿﴾ (الحج)

جنابِ صدرِ مجلس اور معزز سامعین کرام!

میں یہ روایتی طور پر نہیں کہہ رہا' بلکہ میں واقعتاً ڈاکٹر ابصار احمد صاحب کا بہت ہی شکر گزار اور ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اس ذی وقار سیمینار میں آنے کی دعوت دی اور مجھے یہ موقع فراہم کیا کہ میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی ملی' دینی اور قرآنی خدمات کے بارے میں انہیں خراجِ تحسین پیش کروں —— ایک کہاوت ہے کہ بچہ اپنے حال کے اندر جیتا ہے اور اپنے حال ہی میں مگن رہتا ہے' جوان مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے' جبکہ بوڑھا اپنے ماضی کے اندر جھانکتا ہے۔ تو آج مجھے بھی اپنے ماضی (قریب اور بعید) میں جھانکنے کی توفیق ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی سب سے بڑی پہچان تو رجوع الی القرآن کے حوالے سے ہے اور یہی میرا موضوع ہونا چاہیے تھا' لیکن میں نے آج اپنی گفتگو کے لیے ایک دوسرا موضوع ''ڈاکٹر اسرار احمد کا تصورِ خلافت'' اختیار کیا ہے۔ اس لیے میں ڈاکٹر صاحب کی تحریک رجوع الی القرآن کے بارے میں مختصر سی بات کہوں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے جس طرح قرآنی آیات اور قرآنی تنزیلات سے ہماری اجتماعی اور انفرادی زندگی کا تقابل پیش کیا ہے' وہ بہت ہی ممتاز چیز ہے۔ جب پاکستان کی عمر کے چالیس سال پورے ہوئے تو اس وقت انہوں نے ایک مضمون لکھا: ''پاکستان کی عمر کا چالیسواں سال اور اس کی دینی و تاریخی اہمیت'' جس میں انہوں نے بنی اسرائیل اور پاکستان کے مسلمانوں کا آپس میں تقابل کیا اور بنی اسرائیل کی تاریخ کے حوالے سے اس



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آیت سے استشہاد کیا: ﴿قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ﴾ (المائدۃ:۲۶) ’’(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: اب یہ (ارضِ مقدس) حرام رہے گی ان پر چالیس سال تک، یہ بھٹکتے پھریں گے زمین میں‘‘۔ بنی اسرائیل اپنی نافرمانیوں کے باعث چالیس سال تک ارضِ سینا میں صحرا نوردی کے اندر مشغول رہے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کوڑا ان کے اوپر برستا رہا۔ صحرائے تیہہ میں چالیس سال تک بھٹکنے کے بعد بنی اسرائیل کی نشأۃ ثانیہ ہوئی تھی۔ اس بنیاد پر محترم ڈاکٹر صاحب نے اُس وقت اس اُمید کا اظہار فرمایا تھا کہ کیا عجب کہ اب پاکستان بھی چالیس سال تک اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد اپنے اصل مقصدِ قیام کی طرف رجوع کر لے —— اور ع ’’کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو!‘‘ والا معاملہ بن جائے۔ لیکن ع ’’اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!‘‘

اسی طرح جب ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی اظہار احمد قریشی صاحب چالیس سال کے ہوئے تھے تو ڈاکٹر صاحب نے انہیں ایک کارڈ پیش کیا تھا، جس پر سورۃ الاحقاف کی یہ آیت تحریر کی تھی: ﴿حَتّٰى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ...... ﴾ (آیت ۱۵) ’’یہاں تک کہ جب وہ اپنی قوت کو پہنچا اور اس کی عمر چالیس سال ہوگئی......‘‘ اور بعد ازاں اسے میثاق میں بھی چوکھٹے میں شائع کیا تھا۔ چالیس سال کی عمر میں جبکہ انسان کی جوانی ایک خاص مرحلے پر پہنچ رہی ہوتی ہے اُس وقت انسان کی بصیرت کے اندر اضافہ ہوتا ہے اور انسان سنِ رُشد کو پہنچتا ہے۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے سورۃ الحدید کی روشنی میں جس انداز سے انسانی زندگی کے پانچ ادوار کا تقابل کیا ہے، وہ بہت ہی خوبصورت اور بہت ہی اونچی چیز ہے۔ آپ نے سورۃ الحدید کی اس آیت:

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ⑳﴾

کے حوالے سے انسانی زندگی کے پانچ ادوار کا تذکرہ کیا ہے کہ یہ کس طرح انسان کے بچپن، اس کی جوانی اور اس کے بڑھاپے پر منطبق ہوتے ہیں۔ یہ ساری باتیں جس خوبصورت انداز میں کہی ہیں وہ پڑھنے اور سمجھنے کی چیز ہے، دل میں بسانے کی چیز ہے۔ اس لیے کہ اس سے انسان کی دنیا سنورتی ہے، اسے اپنی آخرت کے بارے میں سوچنے کا احساس ہوتا ہے اور اس کے ذریعے اس کی زندگی کے اندر انقلاب آتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہی سب سے بڑا کمال ہے کہ انہوں نے سوتے دلوں کو بیدار کیا ہے اور مُردہ دلوں کے اندر زندگی کے شرارے بخشے ہیں۔ یہ ان کا اعجاز اور ان کا کمال ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نُور سے بھرے۔ وہ شخص ایسے کام کر گیا جو بہت سے لوگ نہیں کر سکے۔

اسی طرح انہوں نے سورۃ النور کی آیت:

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۭ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ۭ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْۗءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۭ نُوْرٌ عَلٰي نُوْرٍ ۭ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ㉟﴾



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا جو کلائمکس قائم کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا نور جو کہ قلبِ مؤمن میں ہے' کا تذکرہ کیا ہے' وہ بھی ان کا اپنا منفرد اعجاز ہے۔

یہ سب باتیں میرے ماضی بعید کی ہیں جس وقت میں شروع میں ساہیوال میں ان کے ساتھ ان کے قائم کردہ قرآن ہاسٹل میں ٹھہرا تھا۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب کی خدمات کی تفصیل تو بہت ہے مگر اب میں اپنے آج کے موضوع کی طرف آتا ہوں۔ میرا آج کا موضوع ہے:

## "ڈاکٹر اسرار احمد کا تصوّرِ خلافت"

مجھے لندن میں ایک طویل عرصہ کے قیام کی وجہ سے ڈاکٹر اسرار احمد مغفور و مرحوم کی احیاءِ خلافت' اقامتِ دین اور اصلاح و تجدید کی مساعی کا بھرپور علم ہونے کا دعویٰ تو نہیں ہے' لیکن ہر سال پاکستان کی ایک نہ ایک زیارت اور پھر ڈاکٹر صاحب کے افکار کے ترجمان تینوں جرائد (میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت) کا مسلسل مطالعہ' ڈاکٹر صاحب کی آمد لندن کے موقع پر ملاقاتیں' اُن کی جُہدِ مسلسل اور سعیٔ نا متزلزل' میرے علم و ادراک سے پوشیدہ بھی نہیں رہیں' اس لیے ان سطور کو تحریر کرتے وقت میں بلا جھجک 'علیٰ بصیرۃ' ہونے کا دعویٰ ضرور کر سکتا ہوں۔ شروع ہی میں اس بات کو واضح کرتا چلوں کہ گو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے لیکچروں اور تحریروں میں کہیں کہیں سلطنتِ آلِ عثمان یا خلافتِ عثمانیہ کا ذکر کیا ہے لیکن انہوں نے کبھی اُسے مسلمانوں کے لیے ماڈل قرار نہیں دیا' البتہ ۱۹۲۴ء میں سقوطِ دولتِ عثمانیہ کے بعد ہندوستان میں تحریک خلافت کا برپا ہونا اور بڑے بڑے عمائدینِ اسلام حتیٰ کہ مسٹر گاندھی کا بھی مسلمانوں کی آواز میں آواز ملانا' خلافت کی اس آخری نشانی سے حد درجہ تعلق کا غماز رہا تھا۔ اس لیے میں اس تحریر میں جہاں ڈاکٹر صاحب کے افکار بابت خلافت کا تذکرہ کروں گا وہاں خلافتِ عثمانیہ کے قریب ترین عملی ماڈل ہونے کی بنا پر دونوں کا تقابل بھی کرتا چلوں گا' چاہے وہ مثبت ہو یا منفی۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے دعوتِ دین کا عملی آغاز تو جمعیت طلبہ اور پھر جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم سے کیا' لیکن پھر جماعت سے علیحدہ ہونے' تنظیم اسلامی کی بنیاد رکھنے کے مراحل میں اُسی صور کو پھونکا کہ جس کی گونج بیسویں صدی کے اوائل میں مولانا ابوالکلام آزاد کے 'الہلال'، 'البلاغ' اور پھر 'حزب اللہ' کی صدائے ہشیار باش کی شکل میں بلند ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی فکر کے سوتوں کو ان تین ہستیوں (مولانا آزاد' ڈاکٹر اقبال اور مولانا مودودی) کے دامنِ فکر سے پھوٹتے دیکھا ہے' اس لیے بہتر ہو گا کہ پہلے خاص طور پر مولانا آزاد اور مولانا مودودی کی آراء بابت خلافت پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

مولانا آزاد پہلے تو مسلمانوں کی قومی زندگی کے عروج و زوال کا گر بتاتے ہیں کہ اس کا اصل دور وہی تھا جب ان کی قومی و انفرادی' مادی و معنوی' اعتقادی اور عملی زندگی پر اجتماع و ائتلاف کی رحمت طاری تھی اور ان کے تنزل و اِدبار کی اصل بنیاد اس دن پڑی جب ائتلاف و اجتماع کی جگہ اشتات و انتشار کی نحوست چھانی شروع ہو گئی۔ پھر وہ نبی ﷺ کی ذات بابرکات میں اُن تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو مجتمع مانتے ہیں کہ جس سے ایک حکومت کو بقا اور دوام حاصل ہوتا ہے وہ ان کی مختلف حیثیتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اللہ کا پیغمبر تھا'



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شریعت کا مقنن تھا' امت کا بانی تھا' ملکوں کا حاکم اور سلطنت کا مالک تھا۔ وہ اگر پتوں اور چھال سے پٹی ہوئی مسجد کے منبر پر وحی الٰہی کا ترجمان اور انسانی سعادت وہدایت کا واعظ تھا تو اسی کے صحن میں یمن کا خراج تقسیم کرنے والا اور فوجوں کو میدان جنگ میں بھیجنے کے لیے سپہ سالار لشکر بھی تھا۔ وہ ایک ہی وقت اور ایک ہی زندگی میں گھروں کا نظامِ معاشرت درست کرتا اور نکاح وطلاق کے قوانین نافذ کرتا اور اس کے ساتھ ہی بدر کے کنارے دشمنوں کا حملہ بھی روکتا اور مکہ کی گھاٹیوں میں سے ایک فاتح حکمران کی طرح نمایاں بھی ہوتا تھا' غرضیکہ اس کی ایک شخصیت کے اندر مختلف حیثیتیں اور منصب جمع تھے۔ اسلام کا نظام دینی یہی تھا کہ یہ ساری قوتیں ایک ہی فرد میں جمع رہیں۔

پھر وہ لکھتے ہیں:

''جب آپ ﷺ دُنیا سے تشریف لے گئے تو خلفائے راشدین کی خلافت اِسی اجتماعِ قُویٰ ومناصب پر قائم ہوئی اور اسی لیے اس کو منہاجِ نبوت سے تعبیر کیا گیا' یعنی یہ نیابت ٹھیک ٹھیک' ہر لحاظ اور ہر پہلو سے شخص جامع نبوّت کی سچّی قائم مقامی اپنے اندر رکھتی تھی۔ منصبِ نبوت مختلف اجزائے نظر وعمل سے مرکب ہے' ازاں جملہ ایک جزؤ وحی وتنزیل کا موردِ ہونا اور شریعت میں تشریع وتأسیسِ قوانین کا اختیار رکھنا ہے' یعنی قانون وضع کرنا اور اس کے وضع وقیام کی معصومانہ وغیر مسئولانہ قوت' اس جزء کے اعتبار سے نبوت آپ کے وجود پر ختم ہو چکی ہے اور قیامت تک کے لیے شریعت وقانون کے وضع وقیام کا معاملہ کامل ہو چکا تھا''۔ (قرآن کا قانون عروج وزوال' ص۶۰۔۶۱)

اس کے بعد وہ یہ بتاتے ہیں کہ خلافتِ راشدہ میں سوائے وحی وتشریع کی نیابت کے باقی تمام امور کی نیابت حاصل تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ'' جس طرح داعیٔ اسلام کا وجودِ نبوت کے ساتھ خلافتِ ارض' حکومت وسلطنت' نظام وقوامِ سیاست' قیادتِ فوج وحرب' فتح وعمرانِ ریاست' مجالسِ شوریٰ وغیرہ' جہاں بانی وحکمران کے تمام منصب تنہا اپنی شخصیت کے اندر رکھتا ہے' اسی طرح خلافتِ خاصّہ میں بھی خلفاء راشدین کا تنہا وجود ان ساری نظری وعملی قوتوں اور تمام منصوبوں کا جامع ہوا۔ وہ ایک ہی وجود کے اندر صاحبِ امامت وخلافت بھی تھے' صاحب اجتہاد وقضا بھی تھے اور صاحب سیاست ونظم وحکامِ بلاد بھی' اصلاً ''امامتِ کبریٰ'' کا مقام اجتہاد دینی اور سیاست ملکی دونوں سے مرکب ہے۔ اس لیے ان کی امامت میں دونوں قسمیں اپنی تمام شاخوں کے ساتھ اکٹھی ہیں''۔ (ص۶۲)

اور پھر اجتماع وائتلاف کی یہ حالت' بقول مولانا آزاد' حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ختم ہوگئی' قوتوں کا انتشار شروع ہوگیا اور اس کی تفصیل وہ یوں بتاتے ہیں: ''حکومت وفرمانروائی کا ٹکڑا الگ ہوکر مجرد شاہی کی شکل میں آگیا۔ اسی کی طرف اشارہ تھا: **الخلافة بعدی ثلاثون سنة ثم مُلك**۔ سو واقعی اس کے بعد صرف پادشاہی ہی رہ گئی' اجتہاد اور قضاءِ شرعی کا جزء خلافت سے الگ ہوا تو مجتہدین وفقہاء کی ایک جماعت پیدا ہوگئی' انہوں نے یہ کام سنبھالا۔ اسی طرح تعلیم وتربیتِ روحانی کے کاروبار سے نظامِ حکومت بالکل الگ ہوگیا''۔ (ص۶۳)

مولانا آزاد بیعتِ خلافت اور بیعتِ ارشاد کا مسئلہ بھی چٹکیوں میں حل کر دیتے ہیں' وہ کہتے ہیں: ''پہلے خلافت کی ایک ہی بیعت تمام مقاصد کی کفیل تھی' اب خلیفہ کا وجود محض پادشاہی کے لیے اور فقہاء کا مجرّد استنباطِ



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

احکام ومسائل رہ گئے تو تزکیۂ نفوس اور ارشادِ قلوب کے لیے ایک دوسری بیعت مستقلاً قائم ہوئی' جو بیعتِ توبہ وارشاد ہوئی اور اس طرح اصحابِ طریقت وتصوف کی بنیاد پڑی۔'' (ص ۶۵)

ڈاکٹر اسرار احمد نے یہاں اس بات کا اضافہ کیا کہ اصل بیعت تو بیعتِ خلافت ہی ہے' جو ایک مخصوص علاقے میں حکمرانی کے منصب پر فائز ہوتا ہے' لیکن اگر ایسی خلافت موجود نہ ہو تو خلافتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے جو بھی جماعت آگے بڑھے اُس کا نظم بھی امیر جماعت کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر قائم ہوگا' لیکن چونکہ یہ ایک نظریاتی بیعت ہے' اس لیے وہ اختلاف یا عدمِ امتزاج کی صورت میں اس بیعت کو فسخ کر سکتا ہے۔ وہ مولانا مودودی کے اس نظریہ سے بھی اتفاق کرتے ہیں کہ اگر ارکانِ جماعت' دستورِ جماعت سے حلفِ پاسداری اُٹھالیں تو وہ بھی بیعت ہی کی ایک شکل ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب جماعت اسلامی سے وابستگی کے دوران تو اس شکل پر قانع رہے لیکن ''تنظیم اسلامی'' کے لیے انہوں نے طریقِ بیعت ہی کو ترجیح دی۔

مولانا آزاد اپنی کتاب ''ہجر ووصال'' میں حدیث ''خیر القرون'' کا خلافت کی مدت تیس سال ہونے سے اس طرح ربط قائم کرتے ہیں کہ گو محدثین نے قرن کے مفہوم کے تعین میں اختلاف کیا ہے لیکن چونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے (**الخلافة بعدی ثلاثون سنة**) کہہ کر تیس سال کی مدت کا تعین کر دیا ہے اس لیے یقیناً اس حدیث میں قرن سے مراد دس برس کا زمانہ ہے اور مقصود یہ ہے کہ بہترین وہ سالہ دور آنحضرت ﷺ کا تھا' اس کے بعد دوسرا عشرہ اور اس کے بعد تیسرا' جس کے بقیہ چھ مہینے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی خلافت سے پورے ہو گئے اور پھر زمانہ شر وفتن کا شروع ہوگیا۔'' (ص ۳۳۳) لیکن مولانا آزاد کی یہ توجیہہ اسی وقت خلافت راشدہ پر صادق آسکتی ہے جبکہ آنحضور ﷺ کے دہ سالہ دور کو بطور ماڈل شمار کیا جائے اور خلافت کے پہلے دو عشروں کو اصلاً اور آخری عشرہ کو تبعاً خلافت کا حصہ شمار کر کے تیس سال کی مدت پوری کی جائے' کیونکہ حدیث میں (**خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونُھم**) کے مطابق آنحضور ﷺ کے قرن کے بعد صرف دو اور قرون کا ذکر کیا گیا ہے کہ جن کی مدت بیس سال بنے گی نہ کہ تیس سال۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ قرنِ اوّل سے مراد عہدِ نبوت وصحابہ' قرنِ ثانی سے تابعین اور قرنِ ثالث سے تبع تابعین کا زمانہ مراد لیا جائے کہ قرونِ ثلاثہ میں مجموعی طور پر خیر کا غلبہ تھا اور شر مغلوب تھا۔

خلافت اور ملوکیت کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب جن چند احادیث کا اکثر ذکر کرتے ہیں اُن کی طرف مولانا آزاد بھی اشارہ کر چکے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''چنانچہ خیر القرون والی حدیث کے مطالعہ کے بعد اس حدیث کو دیکھئے جس کو صاحبِ مشکوٰۃ نے ''**باب الانذار والتحذیر**'' کی تیسری فصل میں درج کیا ہے:

> **عن ابن بشیر عن حذیفة قال: قال ﷺ : تکون النبوة فیکم ما شاء اللّٰہ ثم تکون خلافةً علی منھاج النبوة ماشاء اللّٰہ ان تکون ثم یرفعُھا اللّٰہ ثم تکون ملکاً جبریةً فیکون ماشاء اللّٰہ ان یکون ثم تکون خلافةً علی منھاج النبوة۔**
>
> **قال حبیبٌ فلما قام عمر بن عبد العزیز کتبتُ الیه بھذا الحدیث اذکّرہ ایاہ وقلت أرجو**



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

أن تكونَ امير المؤمنينَ بعد المُلك العاضّ والجبرية

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جب تک اللہ کو منظور ہے تم میں وجودِ نبوّت باقی رہے گا۔ اس کے بعد منہاجِ نبوت پر خلافت قائم ہوگی اور جب تک اللہ چاہے گا قائم رہے گی اور پھر اُٹھالی جائے گی اور اس کے بعد جور وظلم کی بادشاہت شروع ہوگی اور جب تک منظورِ الٰہی ہے، رہے گی۔ اس کے بعد محض جبر و تسلّط کی حکومت ہوگی اور وہ بھی مشیتِ الٰہی کے مطابق رہے گی، لیکن اس کے بعد پھر ایک دور خلافتِ نبوت کے دور کا آئے گا۔

حبیب کہتے ہیں کہ جب عمر بن عبدالعزیز تختِ خلافت پر بیٹھے تو میں نے یہ حدیث اُن کو لکھ کر بھیجی کہ مجھے امید ہے کہ آپ اس حدیث کی خبر کے مطابق ملک غضوض اور جبر کے بعد محض بادشاہ ہی نہیں بلکہ امیر المؤمنین ہوں گے۔'' (ص ۳۳۵)

غالباً کاتبِ مقال خلافت علی منہاج النبوۃ کے بعد عربی نص میں ''ملکاً عاضاً'' لکھنے سے رہ گئے ہیں کیونکہ ترجمہ میں اسے ''جور وظلم'' کی بادشاہت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گو ڈاکٹر اسرار احمد نے اس کی صحیح لفظی ترجمانی کی ہے، یعنی ''اسکے بعد کاٹ کھانے والی حکومت کا دور آئے گا''۔ مولانا آزاد اس کے بعد لکھتے ہیں:

''اس میں زمانے کی قید نہیں ہے۔ مگر ترمذی کی حدیث میں جس کو امام موصوف نے دوسری جلد کے باب الفتن میں درج کیا ہے، زیادہ تصریح ہے:

**عن سعید بن جمهان قال ثنی سفینة قال: قال ﷺ الخلافة فی امتی ثلاثون سنةً ثم مُلك بعد ذالِكَ، ثم قال لی سفینة: أمسِك خلافة ابی بکر ثم قال: وخلافة عمر وخلافة عثمان ثم قال أمسِك خلافة علیّ، فوجدناها ثلاثین سنةً، قال سعید فقلت له: ان بنی امیّة یزعمون ان الخلافة فیهم، قال: کذبوا بنوا الزرقاء بل هم الملوك من شرّ الملوك**

''سعید سے روایت ہے کہ سفینہ نے آنحضرت ﷺ کے اس قول کو روایت کیا کہ خلافت میری امت میں صرف تیس سال رہے گی، پھر اس کے بعد محض حکومت و بادشاہت ہے۔ اس کے بعد سعید کہتے ہیں کہ مجھے سفینہ نے کہا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا زمانہ خلافت شمار کرو۔ پھر کہا کہ حضرت عمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم کا عہد خلافت شمار کرو۔ میں نے سب کو جمع کیا تو کُل تیس سال ہوئے، پھر میں نے کہا، یہ تو سچ ہے لیکن بنوامیہ جو سمجھتے ہیں کہ ہم بھی خلیفہ ہیں یہ کیسی بات ہے، حالانکہ بموجب اس حدیث اور تمہاری بیان کردہ تطبیق کے، خلافت قبل از بنی امیہ ختم ہوگئی؟ اس پر سفینہ نے کہا کہ زرقاء کی اولاد (بنوامیہ) نے کذب بیانی کی، وہ خلیفہ کہاں ہیں، وہ تو شریر ترین بادشاہوں میں سے بادشاہ ہیں۔'' (ص ۳۳۶)

ڈاکٹر اسرار احمد نے خلافت راشدہ کے بعد ان دو ادوار کی کھل کر نشاندہی کی ہے اور صاف صاف کہا ہے کہ بعد کی حکومتیں ایسی ''مُلک عضوض'' کاٹ کھانے والی حکومتوں کے ضمن میں آتی ہیں اور یہ سلسلہ یورپین اقوام کے مسلم ممالک پر غلبہ استعمار تک چلتا ہے۔ اور اس کے بعد پھر جبر کا دور شروع ہوتا ہے اور آزادی کے بعد بھی قبائے جمہوریت میں استبدادی قوتیں، ڈکٹیٹر شپ اور شخصی حکومتوں کا جبر قائم ہے، اور اس کا اظہار عوام کے اُس



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غیظ وغضب سے ہورہا ہے جس کی لپیٹ میں تونس اور مصر کے جابرانہ نظام کی بساط پلٹنے کے بعد کئی دوسرے عرب ممالک جیسے لیبیا‘ یمن‘ بحرین اور عمان اور کسی حد تک اُردن بھی آ چکے ہیں۔

سلطنتِ عثمانیہ کی ابتدا تو ایک تُرک سردار عثمان بک کے ہاتھ پر ۲۷ جنوری ۱۳۰۰ء (۴ جمادی الاولیٰ ۶۹۹ھ) میں ہوئی تھی جو موجود ترکی کے شہر اسکی شہر اور اس کے نواح پر مشتمل تھی‘ لیکن پھر وہ وسعت پذیر ہوتی رہی۔ ساتواں سلطان محمد الفاتح ۱۲ جمادی الاولیٰ ۸۵۷ھ (۲۹ مارچ ۱۴۵۳ء) کو قسطنطنیہ فتح کر کے آنحضور ﷺ کی اس حدیث کا مصداق ٹھہرا جس میں اس شہر کے فاتح کو ”نِعم الأمیر“ (کیا ہی بہترین امیر) اور اس کے لشکر کو (نِعمَ الجیش) بہترین لشکر قرار دیا تھا‘ لیکن پھر نویں سلطان یاووز سلیم نے جب ۹۲۳ھ (۱۵۱۷ء) میں مصر فتح کر لیا اور خلافت عباسیہ کے آخری خلیفہ المتوکل علی اللہ کو اپنے ساتھ استانبول (قسطنطنیہ) لے آیا تو علماء و مفتیان کی موجودگی میں جامع ایا صوفیہ میں وہ تاریخی تقریب منعقد ہوئی جس میں خرقہ خلافت سلطان یاووز سلیم کو پہنا دیا گیا۔ وہ اس اعتبار سے بھی خلافت کا مستحق ٹھہرا کہ اب ارضِ حجاز (مکّہ اور مدینہ) بھی اس سلطنت کے ماتحت آ چکے تھے۔

”**الدولة العثمانیه المجهوله**“ کے مصنّفین لکھتے ہیں: ”یہاں ہمیں یہ بات یاد آتی ہے کہ عبدالرحمٰن الداخل جس نے اندلس میں اموی حکومت کی بنیاد ڈالی تھی‘ اپنے لیے خلیفہ کا لقب اختیار کرنے میں ہچکچاتا رہا کیونکہ وہ اس بات کا قائل تھا کہ خلافت ایک ہی ہوسکتی ہے‘ ایک سے زائد نہیں‘ اور خلیفہ شرعی کے لیے حرمین شریفین کا حامی ہونا ضروری ہے‘ جو کہ اُس وقت عباسی خلیفہ کو حاصل تھی۔ لیکن پھر عبدالرحمٰن ثالث کے دور میں اموی خلافت کا بھی اعلان کر دیا گیا حالانکہ وہ حرمین شریفین پر کنٹرول نہ رکھتا تھا‘ اور یوں فاطمی خلافت کو شمار کرتے ہوئے تین خلافتیں ایک وقت میں جمع ہو گئیں۔“

اسی کتاب کے مؤلّف خلافت کی نوعیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”خلافت کا مقام دراصل رسول ﷺ کی اتباع کا مقام ہے‘ اور اس کا کما حقہٗ حق بعد کے ادوار میں نہیں کیا گیا۔ اس لیے بعض محققین خلافت کی دو قسمیں کرتے ہیں۔ پہلی حقیقی یا کامل خلافت جس میں خلافت کی ساری شرائط مجتمع ہوں‘ اور جو کہ اس انتخاب کے نتیجے میں قائم ہوتی ہے جو مسلمانوں کی باہمی رضامندی اور بیعت کے اصول پر وجود میں آتی ہے۔ ترکی کے سب بڑے فقیہہ ”صدر الشریعہ“ اس خلافت کو خلافت نبوت سے یاد کرتے ہیں۔ دوسری شکلی یا صوری خلافت‘ یعنی وہ امامت جو ضروری شرائط پر پوری نہ اترتی ہو یا وہ حکومت جو بذریعہ انتخاب اور بیعت سے وجود پذیر نہ ہوئی ہو بلکہ جبر و اکراہ اور زبردستی تسلط کے نتیجے میں قائم ہوئی ہو‘ ایسی حکومت میں ”سلطنت“ کا عنصر نمایاں ہوتا ہے اور رسول ﷺ فرما گئے ہیں: **الخلافة من بعدی ثلاثون عاماً ثم یکون حکماً عضوضاً** اور فقہاء کے اتفاق کے مطابق حقیقی خلافت کا دور خلفاء راشدین بشمول سیدنا الحسنؓ کے گزر گیا اور اس کے بعد اُموی اور عباسی دور دوسری قسم خلافت کا تھا۔ سلاطین بنی عثمان کو بھی علی الاقل دوسری قسم میں شامل کیا جانا چاہیے‘ ان کی خلافت ہر صورت صلاحیتوں (بمعنی حقوق) اور ذمہ داریوں سے خالی نہیں تھی بلکہ تمام سلاطین خلفاء تھے‘ حقوق اور ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے تھے۔“

دسویں سلطان‘ سلیمان القانونی کے القاب ملاحظہ ہوں جو فقیہہ ابوالسعود آفندی نے سلطان کے وضع کردہ



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتاب قانون کے دیباچہ میں لکھے ہیں:

"السلطان ابن السلطان، السلطان سلیمان خان ابن السلطان سلیم خان، خلیفة رسول ربّ العالمین، مِمهّد قوانین الشرع المبین، وظلّ اللّٰہ الظلیل علی کافة الأمم، حائز الامامة العظمیٰ، وسلطان البحر، وارث الخلافة الکبریٰ کابرا عن کابر، ناشر القوانین السلطانیه والخاقان العاشر، سلطان العرب والعجم والروم، حامی حمی الحرمین المحترِمَین والمقَامَین المعظّمین المفخّمین"

ڈاکٹر اسرار احمد دورِ ملوکیت کے سلاطین وخلفاء اور موجودہ دور کی آمرانہ اور استبدادی حکومتوں پر نیش زنی کرنے کے ساتھ ساتھ اُن اچھے اقدامات کو سراہنے میں بخل سے کام نہیں لیتے جو ان حکومتوں کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوئے، جیسے پاکستان میں قراردادِ مقاصد کا پاس ہونا، قادیانیوں کو اقلیت قرار دیا جانا، یا سعودی عرب میں بدعات کا قلع قمع کیا جانا اور کتاب وسنّت کی ترویج میں جرأت مندانہ کارنامے انجام دینا۔ البتہ ہمیں مولانا آزاد کے اس تجزیے سے اتفاق نہیں جو سلطان عبدالحمید خان سے متعلق ہے۔ وہ ''قرآن کا قانونِ عروج وزوال'' میں لکھتے ہیں: ''البتہ جو انقلاب سلطان عبدالحمید خان کے زمانہ میں ہوا اور جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلاطینِ عثمانیہ کی خلافت طریق استبدادی وشخصی سے طریق شوریٰ میں تبدیل ہوگئی، سو بلاشبہ خلافتِ راشدہ کی طرف عود ورجعت کا یہ ایک مبارک اقدام تھا جس کے لیے شوریٰ اور پارلیمنٹ کا ہونا سب سے پہلی شرط ہے۔'' (ص ۶۵) یہ درست ہے کہ سلطان عبدالحمید نے اپنے دور میں سیاسی حالات سے مجبور ہو کر دستور وضع کیا کہ جسے مفر الآلوسی (۱۸۵۳ء) اور مشہور صوفی شیخ سعید النورسی کی حمایت حاصل رہی لیکن اُسے شریعت کے منافی بھی قرار دیا گیا اور خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس میں غیر مسلموں کو بھی نمائندگی دی گئی تھی، اور انہی غیر مسلم عناصر کے اصرار پر مملکت رُوس کے ساتھ دولت عثمانیہ کو جنگ میں جھونک دیا گیا اور ہزیمت پر ہزیمت اٹھانا پڑی، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سلطان عبدالحمید کا تینتیس سالہ دور اُس کے اپنے شخصی اور تحکمانہ اسلوب کی بنا پر کامیاب رہا ورنہ جمہوریت کی گردان کرنے والے اس کے وزراء (بشمول مدحت پاشا جو کہ صدر اعظم کہلاتے تھے) بہت پہلے اُس کی بساط حکومت لپیٹ چکے ہوتے اور سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ۱۹۲۴ء سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ یہ سلطان عبدالحمید ہی تھا جس نے تھیوڈر ہرٹزل (۱۸۶۰۔۱۹۰۴) کی فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کے سلسلہ میں ایک بڑی مالی پیشکش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا: ''میں سرزمینِ فلسطین کی بالشت برابر زمین بھی نہیں بیچوں گا، یہ وطن میری ملکیت نہیں بلکہ تمام اُمتِ عثمانیہ کا ہے۔ اُمت نے یہ زمین اپنا خون دے کر حاصل کی ہے اور ہم اُسے بغیر خون کے واپس نہیں کریں گے۔''

اور پھر جونہی مدحت پاشا کی ''الاتحاد والترقی'' کے نام سے ۱۸۹۰ء میں پارٹی قائم ہوئی، فلسطین کے موضوع پر ڈھیل دینے کا آغاز ہوگیا۔ یہ پارٹی، فرانسیسی انقلابیوں کے تین نعروں (شعار) کی حامل تھی، یعنی حریّت، انصاف، مساوات واخوت۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں میں ڈاکٹر اسرار احمد کی بصیرت کی داد دوں گا کہ انہوں نے اپنے افکار میں دو باتوں کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ایک یہ کہ مسلمان حکومت (اور یہاں مراد ہے پاکستان) کی پارلیمنٹ قانون سازی کا ادارہ ہے' اور قانون چونکہ شریعت اسلامیہ سے سرِمُو متجاوز نہیں ہوسکتا اس لیے وہاں غیر مسلم اعضاء کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ وہ بات ہے کہ جسے علماءِ عصر میں سے بہت کم لوگ کہنے کی ہمت رکھتے ہیں۔

دوسری بات کہ جس کے پیش کرنے والے صرف اور صرف ڈاکٹر اسرار احمد ہیں کہ پاکستان کی اراضی کی نوعیت اراضی خراج ہے یعنی یہ زمین مسلمانوں نے بزور بازو حاصل کی تھی اس لیے یہاں جاگیرداری کی کوئی گنجائش نہیں۔

سلطنتِ عثمانیہ میں تمام مفتوحہ علاقوں کو ''اراضی امیریہ'' سے تعبیر کیا گیا اور اس میں تصرّف کے بارے میں آلِ عثمان نے مالکی مذہب کے قول کو اپنایا کہ جس کے مطابق اراضی مفتوحہ کی ملکیت حکومت کے ہاتھ میں رہتی ہے اور رعیت کو کچھ مالی معاوضے کی صورت میں حقِ انتفاع حاصل ہوتا ہے۔ گویا یہ اراضی مسلمانوں کے اجتماعی مصالح کے لیے وقف ہیں۔ آلِ عثمان نے یہ نظام ''سلجوقی سلطنت'' سے وراثت میں پایا تھا جسے اُن کے ہاں ''اراضی مملکت'' یا ''اراضی سلطان'' یا ''حاصل کردہ اراضی'' کہا جاتا تھا۔ اس نظام سے نہ صرف مالی فوائد حاصل ہوئے بلکہ عسکری قوت بھی فراہم ہوئی۔ سلیمان قانونی کے دور میں شیخ ابوالسعود نے اراضی امیریہ کے لیے مفصل قوانین وضع کیے جو شریعت کی روشنی میں لکھے گئے۔ (ص ۵۸۶)

یعنی حکومت ان اراضی کو کسی کی شخصی ملکیت میں نہیں دے سکتی' کسی کو بطور جاگیر نہیں عطا کرسکتی بلکہ وقف کی طرح ضرورت مند لوگ اس سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں لیکن زمین میں وراثت جاری نہیں ہوگی۔ مجھے اکثر تعجب ہوتا تھا کہ ڈاکٹر اسرار احمد اس موضوع پر اتنا زور کیوں دیتے ہیں' لیکن یہ عقدہ کھلا تو بہت بعد میں آ کر کھلا' **فجزاہ اللّٰہ عن الاسلام والمسلمین خیرًا۔**

یہاں تک تو تذکرہ ہوگیا مولانا آزاد اور ڈاکٹر اسرار کے فکری تعلق کا' اب کچھ تذکرہ ہوجائے مولانا مودودی سے ڈاکٹر صاحب کے خوشہ چین ہونے کا۔

گو ڈاکٹر اسرار جمعیت اور جماعت کے تعلق سے عملی طور پر صرف پانچ سال مولانا کے ہم سفر رہے ہیں' وہ سحرِ مودودی سے کبھی نکل نہیں پائے۔ وہ اُن کے اس فکر کے پیغامبر ہیں جو انہوں نے تقسیم سے پہلے اُجاگر کیا تھا۔ اپنی کتاب ''تحریکِ جماعتِ اسلامی'' میں وہ مولانا مودودی کے افکار کو خوب شرح وبسط کے ساتھ بیان کرتے ہیں جو ان کی رگ رگ میں بسا ہوا تھا۔ ہم صرف اُس کا خلاصہ بیان کرسکتے ہیں۔

انہوں نے قانونی اور حقیقی مسلمان کا فرق واضح کیا' ایک صرف کلمہ گو مسلمان جو زیادہ سے زیادہ نماز روزہ کا پابند اور دوسرا وہ جو کافرانہ نظام سے بغاوت کا اعلان کرتا ہو' انگریزوں کی فوج ہو یا نظام عدالت' وہ اس کی نوکری پر لعنت بھیجتا ہو۔ زیادہ سے زیادہ اُن شعبوں میں ملازمت کا جواز پیدا کیا جن سے مفاد عامہ وابستہ ہو۔

انہوں نے بتایا کہ قومیں نسل ونسب کی بنا پر بنتی ہیں لیکن مسلمان ایک جماعت ہیں' حزب اللہ ہیں' اُمّتِ



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمہ ہیں۔ اُن کا وطن زمین کا ایک ٹکڑا نہیں بلکہ وہ آفاقی ہیں۔ وہ مسلم قوم پرستی کے نہیں بلکہ اسلام پرستی کے قائل تھے'ان کے نزدیک مسلمان کا اصل کام دنیا میں حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی دعوت دینا اور آخرت میں اللہ کی رضا کا حصول تھا' وہ قومی حکومت نہیں بلکہ اصولوں کی حکومت کے قائل تھے۔

ڈاکٹر اسرار احمد واضح کرتے ہیں کہ مولانا آزاد' مولانا مودودی' علامہ مشرقی اور خیری برادران سب ہی حکومتِ الٰہیہ کی اصطلاح پر اتفاق کرتے تھے' یہ مولانا امین احسن اصلاحی تھے جنھوں نے جماعت میں اقامتِ دین اور شہادت علی الناس کی اصطلاح کو رواج دیا۔

مولانا مودودی اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے ایک صالح جماعت کا تصور رکھتے تھے' ایسی جماعت جو اپنے قول و فعل سے' اپنی دعوت و تبلیغ سے' اور اپنی جہدِ مسلسل سے عوام کے ذہنوں میں ایسا انقلاب برپا کر دے کہ وہ کافرانہ نظام کو گلے میں پھنسی ہوئی ہڈی کی طرح ہضم نہ کر پائیں۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ سیکولر جمہوریت پر مبنی کافرانہ نظام سے ایک اسلامی نظام جنم نہیں لے سکتا۔ وہ مسلم لیگ کے فکر سے اتفاق نہیں کرتے تھے کہ پہلے ایک قومی اسٹیٹ بنا لو اور اس کے بعد اُسے جو چاہو جامہ پہنا دو۔ ان کے نزدیک ایک کافرانہ نظام اسلامی حکومت کو جنم نہیں دے سکتا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے اس اُسوۂ حسنہ کی پیروی کرنا چاہتے تھے کہ سرزمین عرب میں جہاں ہر طرح کی بُرائیاں تھیں' مسائل تھے' آپ ﷺ نے صرف توحید باری تعالیٰ کی طرف دعوت دی' اور اسی دعوت کے نتیجہ میں بالآخر ایک اسلامی اسٹیٹ بھی قائم ہوگئی۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ جماعت نے تقسیم سے قبل اُمت کے دوسرے مسائل جیسے قضیہ فلسطین یا قیام پاکستان کی جدوجہد سے بے اعتنائی برتی' کیونکہ اصل کام تو اقامتِ دین اور لوگوں پر دین کا گواہ بننا تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر پاکستان بن بھی گیا تو ہمارا کام معاشرے میں بنیادی تبدیلی لانا ہوگی کہ جس کے نتیجے میں صالح قیادت وجود میں آئے گی۔ جماعت کے ارکان کو اپنے اس مقصد سے والہانہ لگاؤ تھا' جماعت میں داخل ہوتے وقت وہ اس طرح حلف اٹھاتے جیسے کوئی نومسلم حلقہ بگوشِ اسلام ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر اسرار صاحب تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد جماعت کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں گاڑی کا رُخ ہوا کے رُخ کی مانند ہوگیا۔ مولانا نے مسلم قوم ہونے کا اعتراف کیا اور پھر اس بات کی طرف دعوت دی کہ جب یہاں مسلمان ہی مسلمان بستے ہیں تو یہاں اسلام ہی کا نفاذ ہونا چاہیے۔ انہوں نے جمہوریت کے مقابلہ میں ''تھیوڈیموکریسی'' کی اصطلاح دی اور پھر اس اصطلاح کی خوب پذیرائی بھی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب مولانا مودودی کے نقشِ اوّل کے امین تھے' اُسی کی دعوت دیتے تھے' اس لیے جماعت کو چھوڑ کر اپنے لیے ایک نئی زمین اور نیا آسمان برپا کیا۔ انہوں نے مولانا آزاد کی صدائے خلافت کو بازگشت عطا کی۔ آزاد کے ہاں تو صرف تصور ہی تصور تھا' ڈاکٹر اسرار احمد نے اُسے تحریک کا جامہ پہنایا اور پاکستان کے در و دیوار اس آواز سے گونج اُٹھے۔ انہوں نے خلافت کے ایک ایک جزء کو تفصیلاً بیان کیا' اُسے بال و پر عطا کیے' نظامِ خلافت کے نونکات کو اہدافِ تنظیم میں شامل کیا۔

ڈاکٹر صاحب شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھی بڑے مدّاح ہیں لیکن اُن کا تذکرہ خال خال ملتا ہے۔ وہ اُن



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے اس قول ''فُكّ كلّ نظام'' یعنی پہلے ہر نظام کو تحلیل کرو' کو بڑی اہمیت دیتے ہیں کہ جس طرح پہلے شرک کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں تو توحید کے لیے راستہ صاف ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اسرار' مولانا مودودی اور آزاد کی مانند انسان کو خلیفۃ اللہ مانتے ہیں' اور اس پر نکیر کرنے والوں کو بے اعتنائی سے دیکھتے ہیں' لیکن اصولی طور پر وہ خود بھی مانتے ہیں کہ گو انسان اللہ کا نائب ہے لیکن پاپائیت کی طرح وہ حقوقِ الٰہی کا مالک بن کر لوگوں کی گردنوں پر سوار نہیں ہوسکتا' بلکہ دراصل خلیفہ وقت لوگوں کی نیابت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی شریعت کو نافذ کرنے کے لیے۔ ہمارا ابھی یہی کہنا ہے کہ قرآن وحدیث میں کہیں خلیفۃ اللہ کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی' انسان کو صرف خلیفہ کہا گیا: ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ (البقرۃ:۳۰) اور ﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ﴾ (ص:۲۶) خلیفہ' خَلَفَ سے نکلا ہے یعنی کسی کے بعد میں آنے والا۔ زمین میں انسان سے پہلے بھی کوئی مخلوق (جیسے جنات) آباد تھی' انسان اُن کے بعد آیا تو اُن کا خلیفہ ٹھہرا۔ اور اسی لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفۃ رسول اللہ کہا گیا' خلیفۃ اللہ نہیں۔ انسان کو خلیفہ اللہ کہنا اس اعتبار سے بھی صحیح نہیں کہ خلیفہ تو کسی غائب ہستی کی نیابت کرتا ہے' اور چونکہ اللہ تعالیٰ غیوبت سے پاک ہیں اس لیے دعاءِ سفر میں اللہ کے رسول ﷺ ہمیں ان الفاظ کے کہنے کی تلقین کرواتے ہیں: **اَللّٰھُمَّ انتَ الصَّاحِبُ فی السَّفر والخَلیفَة فی الأھل والمال والوَلد** ''اے اللہ! آپ ہی سفر میں ہمارے ساتھی ہیں اور اہل وعیال کے لیے بھی خلیفہ ہیں''۔ یعنی میں اُن سے غائب ہوں لیکن آپ اُن کے لیے ہر وقت حاضر ہیں کہ ان کی نگہداشت کرسکیں۔ اس بات کو امام ابن تیمیہؒ خوب وضاحت سے بیان کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب خلیفہ کے مفہوم کو سمجھانے کے لیے Vicegerent کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں کہ سلطنت برطانیہ میں بادشاہ یا ملکہ تو انگلینڈ ہی میں قیام پذیر رہتا تھا لیکن ہندوستان میں اس کی طرف سے وائسرائے حکومت کیا کرتا تھا۔ یہ مثال اس لحاظ سے مناسب نہیں کہ ہندوستان یا برطانوی مقبوضات میں وائسرائے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ شاہِ انگلستان خود اتنی دُور سے وہاں کا نظم ونسق چلانے پر قادر نہیں تھا' لیکن خلافت کا مفہوم ابتلاء وآزمائش سے مرتبط ہے۔

﴿وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْمَآ اٰتٰىكُمْ﴾ (الانعام:۱۶۵)

''وہی ہے جس نے تمہیں زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجات کے اعتبار سے فضیلت دی تاکہ جو کچھ تمہیں دیا ہے اُس میں تمہاری آزمائش کرے۔''

ڈاکٹر صاحب جمہوریت کے لیے عوامی حاکمیت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر ایک اسلامی اسٹیٹ میں حاکمیتِ الٰہی کا اقرار کرلیا جائے تو اُسے اسلامی جمہوریت کہا جاسکتا ہے کہ نمائندگی جمہور کا قاعدہ باقی رہے گا' لیکن دستور ساز اسمبلی قرآن وسُنّت کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کر سکے گی۔ یہاں ڈاکٹر صاحب یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ جب اسلام نے اپنے سیاسی نظام کے لیے ایک نام دیا ہے یعنی خلافت تو اُسے کیوں ترک کیا جائے؟

ڈاکٹر صاحب بالآخر اس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ نام چاہے ملوکیت ہو یا جمہوریت' پارلیمنٹ کا ایک



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایوان ہو یا دوٗ وحدانی نظام ہو یا وفاقی' اصل چیز شریعت کا نفاذ ہے' نظام عدل وقسط کو برپا کرنا ہے' مشورہ کے ساتھ حکومت کو چلانا ہے' اس لیے وہ پاکستان میں جمہوریت کو رواں دیکھنا چاہتے ہیں کہ اگر قوم کا معتد بہ حصہ اسلام کے نفاذ کے لیے مخلص ہو تو ووٹوں کی بنا پر وہ یہ مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ خود اس نظام کا حصہ بننا نہیں چاہتے' لیکن اسلام پسند جماعتوں کو اپنے ووٹ سے محروم کرنے کے بھی روادار نہیں۔ وہ خود اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ اگر میرے ساتھ لوگوں کی اچھی بھلی تعداد کھڑی ہو جائے تو پھر ہم دیکھیں گے کہ پاکستان میں مُنکر کو کیسے فروغ دیا جا سکتا ہے! وہ فراہمی قوت قابل قدر تعداد کی موجودگی سے قبل مسلح تصادم کے حامی نہیں' بلکہ پُرامن احتجاج کے قائل ہیں کہ ع ''شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں میری بات!''

اس احتجاجی سیاست کے نتیجہ میں تیونس اور مصر کی آمرانہ قیادتیں گھر سے بے گھر ہو چکی ہیں اور ان سطور کی تحریر کے وقت لیبیا میں اس پُرامن تحریک احتجاج نے مسلح تصادم کی شکل اختیار کر لی ہے جس کے نتیجہ میں خاصا خون خرابہ ہو چکا ہے' لیکن ایک حد تک ڈاکٹر اسرار احمد کے قول کی مصداقیت واضح ہو چکی ہے۔ رونا صرف اسی بات کا تو ہے کہ یہ سارا احتجاج مالی اور دُنیوی منفعت کی خاطر تو ہو رہا ہے لیکن کیا اسلام اور صرف اسلام کی خاطر بھی ہزاروں لاکھوں کا مجمع دھرنا دے سکے گا؟

ڈاکٹر صاحب نے حکومت اور ریاست کا فرق بھی بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے' وہ کہتے ہیں کہ دولتِ عثمانیہ کے سقوط سے قبل گو مسلمانوں کی ایک سے زیادہ حکومتیں رہی ہیں لیکن انہیں اسلامی ریاست کے مختلف انتظامی یونٹوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے' کیونکہ ایک مسلمان بغیر کسی پاسپورٹ یا ویزا کے کہیں بھی جا سکتا تھا' بلکہ ایک مسلم حکومت میں قاضی اور وزیر کا عہدہ بھی حاصل کر سکتا تھا۔

اب ہم خلافتِ اسلامیہ پر مبنی نظام حکومت کے خدوخال کا تذکرہ کریں گے اور دیکھیں گے کہ ڈاکٹر اسرار احمد کے تصورات اس نظام حکومت سے کہاں تک ہم آہنگ ہیں۔

اس موضوع پر میرے علم کی حد تک سب سے بہترین کتاب' اُردن یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد عبد القادر ابوفارس کی ہے جس کا عنوان ہے ''**النِّظام السِّیاسی فی الأسلام**''۔ ہم پہلے اس کے بنیادی مباحث کے عنوانات کا تذکرہ کرتے چلیں تا کہ پھر اصل موضوع سے اسے مربوط کیا جا سکے۔

① اسلامی نظام کی چار بنیادیں:

۱۔ اللہ کی حاکمیت ۲۔ عدل اور مساوات ۳۔ اطاعتِ امیر ۴۔ شورائیت

② اہل شوریٰ کے اوصاف:

مکلف ہونا (یعنی مسلمان' بالغ' عاقل)۔ آزاد ہونا۔ مرد ہونا۔ صاحب علم ہونا۔ وصف عدالت کا پایا جانا (یعنی فاسق نہ ہو)۔

اور مزید دو شرطیں جو مولانا مودودیؒ نے رقم کی ہیں: مسلم ملک کا شہری ہونا' امیدوار اپنے آپ کو نامزد نہ کرے۔

③ اصحاب شوریٰ کے اختیارات:



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صدر حکومت کا انتخاب کرنا اور نا اہلی کی بنا پر اُسے معزول کرنا۔

④ اسلامی حکومت بعہدِ نبوی کیسے قائم ہوئی؟

⑤ صدر اور گورنروں کو کن اوصاف کی بنا پر چُنا جائے؟

⑥ کیا متعدد اسلامی حکومتیں ہو سکتی ہیں؟

⑦ صدر مملکت کو کن القاب سے پہچانا جائے؟

⑧ صدر حکومت میں کیا اوصاف مطلوب ہیں؟

یہاں اہل شوریٰ کی سات شرطوں کے علاوہ مزید یہ شروط بیان کی گئی ہیں: کفاءت (یعنی اس منصب کی اہلیت رکھنا)، جسمانی اعتبار سے صحیح وسلامت ہونا، قریش میں سے ہونا۔

اس آخری شرط کے بارے میں ابن خلدون نے لکھا ہے کہ چونکہ عرب میں قریش کی فضیلت کو تمام قبائل تسلیم کرتے تھے اس لیے وحدتِ امّت کے لیے اللہ کے رسول ﷺ نے یہ شرط رکھی۔

سلاطین آل عثمان چونکہ قریشی نہ تھے اس لیے اُس دور کے فقہاء نے اس شرط کو یہ کہہ کر ساقط کر دیا کہ فی زمانہ ایسا کوئی قریشی موجود نہیں ہے جو طاقت اور عصبیت رکھتا ہو۔

صاحب کتاب نے اس شرط کو اس انداز میں لیا ہے کہ اگر امارت کے امیدوار باقی سارے اوصاف میں برابر برابر ہوں تو پھر ان میں سے قریشی کو فضیلت دی جائے۔

⑨ صدرِ ریاست کی ذمہ داریاں یا خلافت اسلامیہ کی پہچان۔

صاحبِ کتاب نے الماوردی الشافعی (ف ۴۵۰ھ) کے حوالہ سے ان دس ذمہ داریوں کا تذکرہ کیا ہے:

(۱) دینِ اسلام کی حفاظت اور اس سے متعلق تمام امور کا انتظام جیسے اقامت الصلاۃ، مساجد کی تعمیر، نظام زکوٰۃ، اسلامی تعلیم کے ادارے، اسلام کے بارے میں شبہات کا ازالہ۔

(۲) تمام تنازعات میں شریعت کے مطابق فیصلے کرنا۔

اور اس ضمن میں قاضیوں کا مقرر کرنا، عدالتوں کا قائم کرنا اور عدالت کے فیصلوں کو نافذ کرنا شامل ہے۔

(۳) ملک میں امن وامان کا قیام کہ لوگ چین کی نیند سوئیں اور بلا خوف وخطر سفر کر سکیں۔

(۴) حدود الٰہی کی تنفیذ تاکہ ملک سے جرائم کا قلع قمع ہو اور اس ضمن میں شہریوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق روا نہ رکھی جائے۔

(۵) ملک کا دفاعی نظام اتنا مضبوط ہو کہ دشمن مملکت اسلامیہ کو میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکے۔

(۶) اعداء اسلام سے جہاد کرتے رہنا تاکہ اللہ کا دین غالب ہو۔

(۷) زکوٰۃ، صدقات، عشور، خراج اور دوسرے واجبات کا جمع کرنا، یعنی بیت المال کا قیام۔

(۸) دولت کی منصفانہ تقسیم یعنی کفالتِ عامّہ کا نظام۔

(۹) صرف اہل افراد کو حکومت چلانے کی ذمہ داریاں سونپی جائیں۔

(۱۰) صدر مملکت یا خلیفہ ہر کام کو اپنی نگرانی میں کرائے۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صاحب ''العقد الفرید'' نے ایک اور ذمہ داری کا اضافہ کیا' یعنی:

(۱۱) ہر کام میں شریعت سے رہنمائی لی جائے اور اس کا التزام کیا جائے۔

اور بعض علماء کی طرف سے دو باتوں کا اضافہ کیا گیا کہ

(۱۲) علم کو پھیلایا جائے۔

(۱۳) رعیت کے ہر فرد کے لیے ایک خوشحال زندگی مہیا کی جائے۔

⑩ صدر ریاست یا خلیفہ کا انتخاب کیسے ہو؟

اس باب میں بتایا گیا ہے کہ خلیفہ کا انتخاب دو مرحلوں پر ہوتا رہا ہے۔ بیعتِ خاصہ اور بیعتِ عامہ۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت سقیفہ بنی ساعدہ میں چند افراد نے کی تھی جن کا شمار اہلِ حل وعقد میں سے ہوتا ہے لیکن ان کی اس نامزدگی کو پھر مسجد نبوی میں عمومی پذیرائی حاصل ہوئی جسے بیعتِ عامہ کا نام دیا گیا ہے۔ اس طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اپنی وفات سے قبل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نامزدگی اُس وقت تمام وکمال کے مرحلہ تک پہنچی جب کھلے عام اُن کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔

حضرت عمرؓ نے اپنی شہادت سے قبل چھ افراد کی کمیٹی خلیفہ کے انتخاب کے لیے نامزد کر دی تھی اور پھر اس کمیٹی کے فیصلہ کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی بیعتِ عامہ سے قبولیت کا درجہ حاصل ہوا۔ ان کی شہادت کے بعد لوگ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بیعت کے طالب ہوئے تو انہوں نے کہا کہ جب تک کھلے عام یہ بیعت نہ ہوگی وہ اس منصب کو قبول نہ کریں گے۔

عصرِ حاضر میں مؤلّفِ کتاب کے نزدیک ہر بڑے شہر میں اہلِ حل وعقد کی ایک مجلس ہونی چاہیے جو خلیفہ کے چناؤ کے بارے میں اپنی رائے پیش کر سکے اور ذرائع ابلاغ کی نئی اور تیز ترین سہولیات کے ہوتے ہوئے اب ایسا کرنا اور زیادہ قابلِ عمل ہو چکا ہے۔

یہاں ''ولایتِ عہد'' کا ذکر بھی کیا گیا ہے' یعنی ایک خلیفہ اپنی زندگی ہی میں ولی عہد کو نامزد کر دے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اُسوہ کو دیکھتے ہوئے فقہاء نے اسے جائز ٹھہرایا ہے' لیکن ایسی کوئی بھی نامزدگی خلیفہ کے اصول (باپ' دادا) یا فروع (اولاد) کے لیے ناجائز قرار دی ہے' لیکن بعض فقہاء نے صلاحیت کی بنا پر اسے جائز بھی قرار دیا ہے اور یہی رائے بنی اُمیہ سے لے کر دولتِ عثمانیہ تک بالفعل قابل قبول رہی ہے' گو اس صورت میں جو کچھ خرابیاں جنم لیتی ہیں اُن کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

⑪ صدرِ حکومت کی معزولی۔

نا اہلی کے علاوہ فسوق وفجور بھی اس کی معزولی کا سبب بن سکتا ہے' یہ اختیار اصحاب حل وعقد کو حاصل ہے۔ اور اگر اس کے لیے تلوار اٹھانی پڑے تو وہ بھی اٹھائی جا سکتی ہے' الّا یہ کہ ایک بڑے فتنہ کا خطرہ ہو۔

خلیفہ خود دستبردار ہو جائے تو ایسا بھی جائز ہے اور اس ضمن میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور معاویہ ثانی (ابن یزید) کی مثالیں دی گئی ہیں۔

عصرِ حاضر میں سول نافرمانی کا راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے اور صدر مملکت کے لیے مدّت کی تعیین بھی کی



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جا سکتی ہے۔

⑫ بیعتِ خاصہ اور بیعتِ عامہ کی بحث۔ (جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے)

⑬ وزارت کی مختلف اشکال کا بیان کیا گیا ہے۔

یہ وہ تیرہ مباحث ہیں جو اس کتاب کے ۳۶۵ صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں' اب ملاحظہ فرمائیں کہ ہمارے ممدوح ڈاکٹر صاحب نے ان موضوعات کے بارے میں کن کن آراء سے نوازا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی حاکمیت: ڈاکٹر صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا منطقی نتیجہ ہے کہ خلافتِ اسلامیہ قائم کی جائے جو کہ ایک نظریاتی ریاست ہوگی جس میں قرآن وسنت کی بالادستی کو یقینی بنایا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ زمانہ نبوت تک شخصی خلافت کا تصور تھا' یعنی نبی ہی صاحبِ امر ہوا کرتا تھا' جیسے داؤد اور سلیمان علیہما السلام اپنے وقت میں اور رسول اللہ ﷺ اپنے زمانہ میں۔ لیکن پھر اجتماعی خلافت کا تصور اُبھرا جس کا آغاز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت سے ہوتا ہے۔ دولتِ عثمانیہ کے ذی قدر سلطان محمد الفاتح نے بانگِ دھل کہا تھا:

"اس خاندان کا سب سے اعلیٰ وارفع مقصد اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنا ہے۔"

اسلامی نظام کی باقی تین بنیادیں یعنی نظام عدل ومساوات کا قیام' امیر کی اطاعت اور شورائیت کے التزام پر ڈاکٹر صاحب پورا یقین رکھتے ہیں' نظام عدل کو وہ اسلامی نظام کا مرکزی خیال قرار دیتے ہیں اور مساوات کو معاشرتی نظام کی اساسِ اول کی حیثیت سے ذکر کرتے ہیں۔ اطاعت امیر پر وہ بے حد زور دیتے ہیں' لیکن اُسے قانون سے بالاتر تسلیم نہیں کرتے۔ اس کی حیثیت قانون کو نافذ کرنا ہے۔ اُسے شوریٰ کی رائے کا احترام کرنا چاہیے' لیکن وہ مولانا مودودی کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ اِسے ویٹو کا حق حاصل ہے' اُس کے ہاتھ باندھے ہوئے نہیں ہونے چاہئیں۔

(۲) اہلِ شوریٰ کے اوصاف: اہلِ شوریٰ کے اوصاف میں وہ اُن کا مسلمان ہونا لازمی قرار دیتے ہیں کہ شوریٰ یا پارلیمنٹ قانون ساز ادارہ ہے جو کہ قرآن وسنت کی روشنی میں قانون وضع کرنے کا پابند ہے تو پھر غیر مسلم ایسے ادارے کے رکن کیسے بن سکتے ہیں؟ خواتین کو وہ ستر وحجاب کی حدود کے ساتھ پارلیمنٹ میں شمولیت کے خلاف نہیں۔ البتہ وہ یہ کہتے ہیں کہ فیصلہ کن امور مَردوں کے ہاتھ ہی میں رہنا چاہئیں۔

دولتِ عثمانیہ کے زوال کے اسباب میں یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ سلطان عبدالحمید ثانی کے دور میں جب بالآخر پارلیمنٹ قائم ہوئی تو اس کے دوسو چالیس ارکان میں سے ساٹھ غیر مسلم تھے' جن کی وجہ سے سلطنت عثمانیہ' روس کے ساتھ غیر ضروری جنگوں میں شامل ہو کر زوال پذیر ہوئی۔

ہالینڈ کے ایک ماہر قانون لکھتے ہیں کہ دولتِ عثمانیہ کے زوال کے اسباب میں اسلام سے لگاؤ شامل نہیں' بلکہ امور حکومت میں خواتین کی غیر ضروری مداخلت تھی۔

(۳) اصحابِ شوریٰ کے اختیارات: اصحابِ شوریٰ کے اختیارات پر ڈاکٹر صاحب نے زیادہ کلام نہیں کیا۔ البتہ وہ کارکنان اسلامی حکومت کے اوصاف کو قرآن کی متعدد آیات اور احادیث سے بیان کرتے رہے ہیں۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۴) اسلامی حکومت بعہد نبوی کیسے قائم ہوئی؟ ڈاکٹر صاحب نے نبی ﷺ کے عملی اُسوۂ حسنہ ہی سے ایک اسلامی حکومت قائم ہونے کے قدرتی مراحل کا تذکرہ بارہا کیا ہے‘ یعنی دعوت‘ ہجرت (جو کہ بدعملی اور غیر اسلامی افعال کو چھوڑنے سے بھی ہو سکتی ہے)‘ باطل کے ساتھ کشمکش اور جس کے نتیجے میں جاء الحق و زھق الباطل کی کیفیت نمودار ہوتی ہے‘ حق کا بول بالا ہوتا ہے اور حق ہی کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔

(۵) صدر حکومت اور گورنروں کو کن اوصاف کی بنا پر چنا جائے؟ ڈاکٹر صاحب صدر کے بلا واسطہ انتخاب کے قائل ہیں اور وہ امریکہ کے صدارتی نظام کو پارلیمانی طریق انتخاب سے بہتر قرار دیتے ہیں۔ ووٹرز کے لیے وہ صرف مسلمان ہونا کافی قرار دیتے ہیں کہ ان میں تقویٰ یا عدم تقویٰ کی بنا پر تفریق نہیں کی جا سکتی۔ البتہ امیدوار مجلسِ شوریٰ یا صدارتِ عظمیٰ کے لیے کبائر سے اجتناب کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ووٹر کے لیے چالیس سال کی عمر کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں کہ اس عمر میں انسان قرآن کی نص کے مطابق حقیقی رُشد (یعنی بصیرتِ تامّہ) کو حاصل کر لیتا ہے۔

امیر جماعت ہو یا خلیفہ وقت‘ اُسے بیعت کے ذریعہ اپنے منصب پر فائز ہونا چاہیے۔ بیعت کے ضمن میں وہ مولانا مودودی کی اس تقسیم سے موافقت کرتے ہیں کہ بیعت تین قسم کی ہو سکتی ہے:

(۱) کسی مخصوص امر پر بیعت لی جائے۔

(۲) خلیفہ وقت کے ہاتھ پر سمع وطاعت کی بیعت کی جائے۔ یہ وہ بیعت ہے کہ جو صرف ایک خلیفہ کے ہاتھ پر کی جا سکتی ہے۔

(۳) وہ جماعت جو اسلامی نظام کے لیے کوشاں ہو اُس کے امیر کے ہاتھ پر بھی بیعت کی جا سکتی ہے جسے دستوری بیعت بھی کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اس تیسری قسم کو اپنی جماعت کے لیے بہتر خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ یہ بیعت‘ خلیفہ وقت کے ہاتھ پر بیعت جیسی نہیں ہے اس لیے بیعت کرنے والا‘ امیر سے ناموافقت کی بنا پر اُسے فسخ بھی کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی ایک تحریر میں حزب التحریر اور اس کے بانی شیخ تقی الدین النبہانی کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہاں اُن کا یہ استدلال ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ وہ اپنی کتاب ’’الشخصیة الاسلامیة‘‘ میں لکھتے ہیں کہ اصول فقہ کے مطابق ’’مالا یتمُّ الواجب الا به فھُوَ واجبٌ‘‘ یعنی اگر ایک واجب کے بروئے کار لانے کا انحصار کسی دوسری چیز پر ہو تو وہ بھی واجب ہو جاتی ہے اور چونکہ نظام خلافت کا قائم کرنا واجب ہے‘ اس لیے ایک ایسی جماعت کا قیام بھی ضروری ہے جو اس واجب کو وجود میں لا سکے۔ البتہ یہاں امیر حزب التحریر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے کہ اصل واجب تو دعوت الی اللہ ہے‘ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا اہل بننا ہے‘ اور اگر ایمان و عملِ صالح کی زندگی اختیار کی جائے‘ داعی الی اللہ کی نصرت کی جائے‘ اور اس تحریک میں جان و مال کا نذرانہ پیش کیا جائے‘ مخالفین دعوتِ اسلام کا صبر و استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کا وعدہ استخلاف بھی پورا ہوتا ہے جیسا کہ صحابہ کے حق میں پورا ہوا تھا‘ یعنی مسلمان کا ہدف اللہ تعالیٰ کا عبدِ حقیقی بننا اور اُس کے دین کی شہادت دینا ہو تو پھر خلافت بطور انعام حاصل ہوتی ہے۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۶) کیا متعدّد اسلامی حکومتیں قائم ہو سکتی ہیں؟ تاریخِ اسلام میں خلافت کا آغاز وحدتِ امّت کے تصوّر کے ساتھ ہوا تھا' اس لیے ایک وقت میں ایک خلیفہ ہی متصور ہو سکتا تھا' اور ایک سے زائد خلیفہ کے ہونے کی بزبانِ نبوی بھی حوصلہ شکنی کی گئی تھی' لیکن جب بنی عباس کی حکومت قائم ہوئی اور اندلس میں بنی امیہ کے ایک امیر عبدالرحمٰن الداخل نے اپنی حکومت کو قائم کر لیا تو فقہاء نے دونوں حکومتوں کے درمیان جغرافیائی بعد کی بنا پر دو خلفاء کو تسلیم کر لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ریاست اور حکومت کے فرق کو ظاہر کر کے اس مسئلہ کی حدت کو کم کرنے کی راہ دکھائی ہے۔ اس کا ایک دوسرا حل مسلمان حکومتوں کی کنفیڈریشن قائم کرنے سے بھی نکل سکتا ہے۔

(۷) صدرِ مملکت کو کن القاب سے پہچانا جائے؟ صاحبِ کتاب اس دفعہ کو علیحدہ سے بیان کر کے غیر ضروری طوالت کا شکار ہوئے ہیں' وہ خلیفہ کہلائے یا امام یا صدرِ مملکت' اصل مقصود یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم کو نافذ کرے۔ داؤد علیہ السلام بادشاہ بھی ہیں اور خلیفہ وقت بھی' لیکن وہ حق کی سرفرازی اور عدل کی بالادستی کی بنا پر عنداللہ مقبول ہوئے' اس کے برعکس اسلامی تاریخ میں کتنے ہی خلفاء ہیں جو اپنے جور و ظلم کی بنا پر اس حال میں دنیا سے رخصت ہوئے کہ اُن کے حق میں کوئی ایک بھی کلمہ خیر کہنے والا نہیں تھا۔

ڈاکٹر صاحب عصری حالات کے تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس موضوع کو زیادہ اہمیت دیتے نظر نہیں آتے' حاکم وقت صدر کہلائے یا خلیفہ' وہ ہر صورت اپنے عمل و کردار سے ہی پہچانا جائے گا۔

(۸) صدر میں کیا اوصاف مطلوب ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے جہاں کارکنانِ جماعت کے اوصاف تفصیل کے ساتھ تحریر کیے ہیں وہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صدر ہر لحاظ سے اُن سے فائق ہو گا' علم میں' کردار میں' معاملہ فہمی اور بصیرت میں' بلکہ وہ قرآن و حدیث سے اتنا باخبر ضرور ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کی جماعت کا امام بھی بن سکے۔

(۹) صدرِ ریاست کی ذمہ داریاں یا خلافت اسلامیہ کی پہچان: الماوردی کی تحریر کردہ دس خصوصیات میں سے چھ تو ڈاکٹر اسرار احمد کے تجویز کردہ نو نکات ''نظامِ خلافت'' میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا پہلا نکتہ زیادہ جاندار اور مقصدِ خلافت کا بھرپور آئینہ دار ہے' اور وہ ہے: نظامِ خلافت اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کے اعلان و اقرار اور قرآن و سنّت کی غیر مشروط بالادستی کے عملی نفاذ کا نام ہے۔

عورتوں کے حقوق و واجبات کے بارے میں دو نکات غالباً اسلامی ممالک میں تحریک آزادیٔ نسواں کے پھیلاؤ اور پروپیگنڈے کے مقابلہ میں ضرورت کی بنا پر رکھے گئے ہیں وگرنہ ان کی جگہ حدودِ الٰہی کا نفاذ اور دفاعِ وطن کا تذکرہ زیادہ مناسب تھا۔

ڈاکٹر صاحب اپنے مفصّل خطابات میں چند اور باتوں کو نظام خلافت کے ضمن میں شدّ و مدّ سے بیان کرتے رہے ہیں' یعنی نظامِ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا قیام۔ سود' شراب اور جوا کا انسداد۔ جاگیرداری کا خاتمہ' مخلوط معاشرے کا سدّ باب۔

وہ مخلوط قومیت کی نفی کرتے ہیں اور غیر مسلموں کو اُن کے پرسنل لاء پر عمل کرنے کی ضمانت دیتے ہوئے



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُن کے حقوق کا تحفظ چاہتے ہیں۔

(۱۰) صدرِ ریاست یا خلیفہ کا انتخاب کیسے ہو؟ اس موضوع پر پچھلے صفحات میں سیر حاصل بحث ہو چکی ہے' ڈاکٹر صاحب استبدادی حکومت یا موروثی سلطنت پر سخت نکیر کرتے ہیں۔ دولتِ عثمانیہ میں وراثتی سلطنت نے جن خرابیوں کو جنم دیا اُن میں سب سے بڑی خرابی ایک سلطان کا اپنے بھائیوں کا قتل کرنا تھا تا کہ وہ یا اُن کی اولاد تخت و تاج میں وراثت کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں۔ محمد الفاتح کے عہد تک تو ولی عہد کے متعین کرنے کا دستور نہ تھا' اہلِ حل وعقد ہی نئے خلیفہ کا انتخاب کرتے تھے۔ لیکن محمد الفاتح کی طرف یہ قانون منسوب کیا جاتا ہے کہ ''میرے بیٹوں میں سے جسے سلطنت حاصل ہو اس کے لیے مناسب ہے کہ وہ نظامِ عالم برقرار رکھنے کے لیے اپنے بھائیوں کو قتل کروا دے' اکثر علماء نے اسے جائز ٹھہرایا ہے ثالث نے اپنے پانچ بھائیوں کو قتل کروایا۔ سلطان محمد ثالث نے اپنے بیٹے محمود اور اُنیس بھائیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

دولتِ عثمانیہ کی طرف سے دفاع کرنے والوں نے مذکورہ واقعات کو بھائیوں یا بیٹوں کی طرف سے سلطان کے خلاف بغاوت کا شاخسانہ قرار دیا' لیکن اس کے باوجود وہ لکھتے ہیں کہ بعض قتل کے واقعات ایسے بھی ہوئے جن کا دفاع نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۱) صدرِ حکومت کی معزولی: اس سے قبل ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اہل حل وعقد کو خلیفہ کی نااہلی کی بنا پر اُسے معزول کرنے کا اختیار ہے' لیکن عملی طور پر ایک طاقتور حکمران کے سامنے ان معدودے چند افراد کی بے بسی آڑے آتی ہے۔ صاحب کتاب ''السّیاسة والاسلام'' سول نافرمانی کا نسخہ پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پُر امن احتجاج کا راستہ تجویز کیا ہے' لیکن وہ جمہوریت کی اس روایت کو زیادہ قابلِ عمل سمجھتے ہیں کہ حاکم کے لیے ایک متعینہ مدّت مقرّر ہو جس کے اختتام پر لازمی طور پر انتخاب عمل میں لایا جائے اور ایک صدر کو مدتِ صدارت دو مرتبہ پورا کرنے کے بعد منتخب کرنے کی اجازت نہ ہو۔

(۱۲) بیعتِ خاصّہ اور بیعتِ عامّہ: اس موضوع پر پہلے سیر حاصل گفتگو ہو چکی ہے' ڈاکٹر صاحب نے مطلق بیعت کا ذکر کیا ہے۔ مذکورہ بالا تفصیل سے اس بات کی گنجائش پیدا ہوتی ہے کہ ہر علاقے کی مجالس حلّ وعقد (یا مشاورتی کمیٹیاں) اگر ایک سے زائد نام پیش کریں تو پھر انتخاب عام کے ذریعے صدر چنا جائے اور دستوری بیعت کی بنیاد پر منصب صدارت کا آغاز ہو۔

(۱۳) انواعِ وزارات کا ذکر: ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع کو تناول نہیں فرمایا ہے۔ ہر ملک اپنی ضروریات کو دیکھ کر مختلف وزارتیں قائم کرتا ہے۔ اصل چیز اہل اور صاحبِ صلاحیت افراد کا انتخاب ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا﴾ ''اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتوں کو اہل افراد کے سپرد کرو۔''

ان تیرہ نکات پر ڈاکٹر صاحب کے خیالات کے تذکرہ کے بعد یہ بحث اختتام کو پہنچتی ہے' لیکن آخر میں ڈاکٹر صاحب کی ایک اہم تجویز کا ذکر بھی ہو جائے۔ وہ ایک مسلم ریاست میں فقہی اختلافات کا حل یوں تجویز کرتے ہیں کہ پرسنل لاء کی حد تک تمام مسالک کو تسلیم کیا جائے اور ملکی قانون سب کے لیے یکساں ہو۔ وہ



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمانانِ ہند کو داد دیتے ہیں کہ انہوں نے ہندوستان کے سیکولرزم کو قبول نہیں کیا جو کہ ہندو قوم کی ذات پات کی تفریق کی بنا پر اپنی ضرورت تھی۔ مسلمانوں نے پرسنل لاء کے تحفظ کے لیے احتجاج کا راستہ اختیار کیا اور وہ کسی حد تک اپنے مطالبات منظور کروانے میں کامیاب رہے۔

جہاں تک ایک مسلم ریاست میں فقہی اختلافات کی بنیاد پر مختلف مسالک کو قانوناً شخصی آزادی دینے کا سوال ہے تو عبادات، رسم و رواج کی حد تک تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن جہاں عائلی نزاعات عدالتوں کے فیصلوں کے مرہونِ منت ہوں جیسے ولی کے بغیر نکاح کے جواز کا مسئلہ، بدعتی طلاق نافذ ہونے کا مسئلہ، طلاق کے بعد بچوں کی کفالت کا مسئلہ وغیرہ تو اس میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ پاکستان میں اسلامی نظریاتی کونسل اور دیارِ غیر میں ''یورپین کونسل برائے فتویٰ اور تحقیق'' کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مختلف مسالک کے علماء مل بیٹھ کر، باہمی مشاورت کی بنیاد پر اور مصلحت عامہ کی خاطر کسی ایک ایسی رائے پر اتفاق کر سکتے ہیں جو مفادِ عامہ اور عصر حاضر کی ضروریات سے مطابقت رکھتی ہو اور اس طرح مسالک کے درمیان بھی مفاہمت اور یگانگی پیدا کی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب علامہ اقبال کے اس قول کی کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق حاصل ہے'' یہ توجیہہ پیش کرتے ہیں کہ حقِ اجتہاد تو علماء کی کونسل ہی کے سپرد ہو گا لیکن پارلیمنٹ کو یہ حق حاصل ہو گا کہ کس کے اجتہاد کو نافذ کرے۔ اس رائے کو تقویت پہنچتی ہے سلاطین آلِ عثمان کے اس طرزِ عمل سے کہ گو انہوں نے عموماً حنفی فقہ کے مطابق قاضیوں کو فیصلہ کرنے کا حق دیا لیکن چند بڑے مسائل میں جن میں اراضی مفتوحہ کو خراجی قرار دے کر حکومت کی ملکیت قرار دیا گیا تھا، مالکی مذہب کی رائے کو اپنایا۔ یہی طرزِ عمل مسئلہ مزارعت، بیع مؤجل اور طلاق ثلاثہ فی مجلس واحد اور کئی دیگر مسائل پر بھی اپنایا جا سکتا ہے جس کی طرف ڈاکٹر صاحب نے بارہا توجہ دلائی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد ؒ وہ خوش بخت اور خوش قسمت شخص تھے جنہوں نے اپنی زندگی کو بامقصد گزارا، رجوع الی القرآن کی آواز کو ایک تحریک میں تبدیل کر دیا، نظام خلافت کے احیا کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کر دیا۔ جس مشن کو انہوں نے ساری عمر حرزِ جان بنا کر رکھا تھا، اُسے آگے بڑھانے کے لیے نہ صرف اپنی صلبی اولاد بلکہ معنوی اولاد پر مشتمل ایک ایسی جماعت کو منظم کیا جو اسلامیانِ پاکستان کے لیے ایک مشعل راہ اور مینارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے اخلاف کو حسن عقیدہ اور حسن عمل کی دولت سے مالا مال رکھے، اُن کی کوششوں کو تمغۂ قبولیت سے نوازے اور اخلاص پر مبنی ہر جد و جہد کو اُن کے لیے توشۂ آخرت بنائے۔

**وما توفیقی الا باللّٰہ، وآخر دعوانا اَنِ الحمدُ للّٰہ ربّ العالمین۔**

---

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔



© rasailojaraid.com